ذیشان احمد مصباحی

تقلید سے اجتہاد تک

اگر میں خود کو مقلد کہوں تو مجھے اندر سے اچھا نہیں لگے گا کہ عقل وشعور ہوتے ہوئے میں دوسرے کا تبع بن جاؤں؟ اور اگر یہ کہوں کہ مجتہد ہوں تو میرا ضمیر میرے جھوٹ پر مجھے ملامت کرے گا۔ موجودہ دنیا میں تقلید واجتہاد کی ساری لڑائی دراصل انہی دو احساسات کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جنھیں ضمیر کی ملامت پسند نہیں وہ بخوشی اس کمتر احساس کو قبول کر لیتے ہیں کہ میں دوسرے کا تبع ہوں اور جن کی انا ماتحتیت کے لیے کسی طور پر راضی نہیں ہوتی انھیں ناچار ضمیر کی ملامت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

تقلید واجتہاد کی بحث بار بار چھڑنے کی ایک بنیادی وجہ ان کے صحیح مفہوم سے ناواقفی بھی ہے۔ یہ ناواقفی عموماً مقلدین وغیر مقلدین دونوں میں پائی جاتی ہے۔ مقلدین مسئلہ تقلید کے تعلق سے بسا اوقات یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین کا قد فقہ اور تدبر میں ہم سے بہت بلند تھا، اتنا بلند کہ ان کی ہر بات ہمارے لیے حرف آخر ہے اور اب ہمیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ تقلید جامد ہے جو غلط ہے گویا جس مقصد کے لیے فقہ کی تدوین ہوئی تھی (بدلتے حالات میں شریعت کی تطبیق اور نو پیدا مسائل کا اصولی حل) اب وہ اسی کے منکر ہو جاتے ہیں۔ غیر مقلدین تقلید کو قرآن وحدیث کے مقابل ایک الگ مصدر شریعت سمجھتے ہیں، اسی لیے مقلدین کے حوالے سے ان کی لن ترانیاں اشراک فی الدین تک پہنچ جاتی ہیں۔

اجتہاد کا مفہوم بھی عموماً ذہنوں میں گڈمڈ ہو جاتا ہے، اجتہاد کے لغوی معنی کوشش کرنے کے ہیں۔ دین کے حوالے سے اس کا مفہوم مسائل شریعت معلوم کرنے کے لیے قرآن وسنت

میں گہرا تدبر اور غور وفکر کرنا ہے۔ اس معنی میں تمام محدثین ومفسرین اور طالبین علوم شریعت مجتہد ہیں، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر قرآن وحدیث میں غور وفکر کرتا ہے، اجتہاد کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے اور وہ ہے غیر منصوص مسائل کا حکم جاننے کے لیے کتاب وسنت میں غور کرنا اور کتاب وسنت سے ان کی نظیر تلاش کرکے فیصلہ صادر کرنا۔ حضرت معاذ ابن جبل کا مشہور اجتهد برائی جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا، اسی معنی میں ہے۔ چوں کہ نئے مسائل ہر دور میں اور ہر خطے میں پیدا ہوتے رہیں گے اس لیے اجتہاد کا یہ تسلسل بھی ہمیشہ قائم رہے گا، فقہا اور اہل علم نے مختلف الفاظ میں اسی اجتہاد کی تعریف کی ہے۔ اجتہاد کا ایک چوتھا معنی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی سب سے زیادہ متنازع ہے اور وہ ہے کتاب وسنت کے اسلوب ومزاج، مقاصد شریعت اور احوال امت کو پیش نظر رکھ کر ایسے اصول وضع کرنا، جن کی روشنی میں کتاب وسنت سے مسائل کا استخراج ہوسکے۔ مثال کے طور پر کتاب وسنت میں بے شمار احکام ہیں۔ لیکن کون حکم فرض ہے کون واجب ہے اور کون مستحب؟ ان مسائل کے ادراک کے لیے ایسے اصول کی ضرورت ہے، جن سے صاف طور پر موقف علمی واضح ہو جائے۔ اجتہاد کو ثابت کرنے والے اور اجتہاد کا انکار کرنے والے عموماً اجتہاد کے ان مختلف مفاہیم کو مدنظر رکھے بغیر ہی بحث طولانی میں اُلجھ جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کو ثابت کرنے کے لیے حضرت معاذ بن جبل کا قول اجتهد برائی پیش کرتا ہے اور کوئی ان کے اجتہاد کو رد کرنے کے لیے حضرت عمر کا قول ایا کم واصحاب الرای پیش کرتا ہے۔ جب کہ دونوں کا یہ مناظرہ انا فی وادوانت فنی واد کے مصداق ہے۔

ایمان داری کی بات یہ ہے کہ فلو لانفر من کل فرقة منهم طائفة اور فاسئلو اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون جیسی قرآنی آیات اور اجتهد برائی جیسے کلمات احادیث سے نہ اجتہاد وتقلید کو ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی فقہ واجتہاد یا قیاس وتقلید کو کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز بتا کر انھیں مسترد کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی دلائل سے جو لوگ اپنا موقف ثابت کرتے ہیں وہ اپنے ضمیر کو اپنی ہی زبان کے خلاف صف آرا پاتے ہیں اور انھیں اس بات کا خوب احساس ہوتا ہے کہ ان کی رائے اپنی ہی رائے کے خلاف ہے۔

''اسلام دین فطرت ہے'' جس مسلمان کو اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو چکا ہے، اسے اس بات کا اعتراف ہے کہ اسلام میں فطرت کے جبری تقاضوں کی تکمیل کے سامان موجود ہیں۔ اور اسلام کی یہ خوبی نزول وحی الٰہی کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر زمانے اور ہر علاقے میں اسلام کا یہ وصف ہمہ گیریت موجود ہے۔ قرآن نے خود قرآن کو قرآن (جو ہمارے سامنے موجود ہے) کی شکل میں جمع و مرتب کرنے کا حکم نہیں دیا۔ نہ کتاب وسنت میں بخاری و مسلم کی تدوین و ترتیب اور ان کے احترام و توقیر کا حکم ہے۔ وقت کے جبر نے تقاضا کیا اور اسلام کی فطرت نے اسے قبول کرلیا۔ اب یہ بڑی احمقانہ بات ہوگی کہ کوئی یہ کہہ کے ہم اس قرآن کے متبع ہیں جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اس قرآن کے نہیں، جس کو حضرت عثمان نے مرتب کیا۔ اسی طرح سفاک حجاج ابن یوسف نے قرآن میں اعراب (زبر زیر پیش) لگا کر قرآن کو ایک نئی طرز میں پیش کیا، اب اگر آج کوئی قرآن سے اعراب مٹانے کا مطالبہ کرے اور یہ کہے کہ کتاب وسنت میں حجاج ابن یوسف کے ذریعے لگائے گئے اعراب کے ساتھ قرآن چھاپنے اور پڑھنے کا حکم کہیں بھی موجود نہیں ہے تو اس کی سادگی پر دعا ہی دی جاسکتی ہے۔

اجتہاد (اسلامی قانون سازی) اور تقلید (کسی خاص مسلک فقہی کے قوانین کی پیروی) بھی اس ذیل میں آتے ہیں۔ میرا ناقص مطالعہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان چیزوں کو براہ راست کتاب وسنت سے ثابت نہیں کیا جاسکتا اور نہ کتاب وسنت سے الگ بتا کر انھیں رد کیا جاسکتا ہے، حالات کے جبر نے اجتہاد کا پر زور مطالبہ کیا اور امت کے سرخیل ماہر اور عبقری افراد نے آگے بڑھ کر اس مطالبے کو پورا کیا۔ جو جنتی بندے یہ قسم کھا چکے ہیں کہ جو باتیں کتاب وسنت میں صراحت کے ساتھ ملیں گی، انھیں کا اتباع لازم ہے، ان کے علاوہ ہر بات مسترد کر دینے کے لائق ہے۔ خواہ وہ امت کا معمول ہو، علما کا اجماع ہو یا اسلاف کا طرز عمل ہو۔ ایسے افراد ہوش کے ناخن لیں کہ ان کے لیے نہ تو کتاب پر عمل ممکن ہے اور نہ احادیث پر۔ اسلام میں مسلمانوں کے ساتھ حسن ظن کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظنوا المومنین خیراً۔ مسلمانوں کے ساتھ اچھا گمان رکھو۔ یہ بڑا بنیادی فلسفہ اور اسلامی ضرورت ہے۔ اگر

اسلاف و اکابر مشکوک قرار پاگئے تو کتاب وسنت کے نام پر جو کچھ سرمایہ ہے، سب شک کے دائرہ میں آجائے گا اور حقیقی اسلام کے متلاشی باب اسلام سے باہر نکلتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد صحابہ کس کی تقلید کرتے تھے؟ کتاب وسنت میں تقلید کا کہاں حکم ہے؟ مجتہدین کس کی تقلید کرتے تھے؟ کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے ائمہ کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ اور ان جیسے سوالات کی بے معنویت واضح ہو جاتی ہے۔ ہاں! یہ سوال اپنی جگہ ضرور رہتا ہے کہ کیا واقعی اجتہاد کرنا حالات کا تقاضا تھا اور اس کے بعد تقلید امت کی مجبوری بن گئی؟ یہ سوال اپنے اندر کافی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا مشکل بھی ہے اور ضروری بھی۔ ضروری اس لیے تاکہ حقیقت روشن ہو اور مشکل اس لیے کہ جس طرح منکرین حدیث کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے، جس نے حدیث کے بغیر اسلام پر گامزن رہنے کو ممکن مان لیا ہے، اسی طرح ایک طبقہ کتاب وسنت کو بہر صورت اپنے لیے کافی سمجھتا ہے۔ اس لیے صرف اجتہاد وتقلید کو پر زور الفاظ میں ثابت کر دینے سے بحث کی تشنگی ختم نہیں ہوسکتی۔ جب تک منکرین کے شکوک وشبہات کی بنیادیں نہ تلاش کرلی جائیں۔

اجتہاد کی ضرورت کیوں پڑی؟

اس معنی میں اجتہاد کہ احکام خدا و رسول میں غور وفکر کرکے ان کے منشا ومطلوب معلوم کیے جائیں یا اس معنی میں اجتہاد کہ منصوص مسائل پر قیاس کرکے یا مزاج شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے غیر منصوص مسائل کے احکام معلوم کیے جائیں، اتنا ہی قدیم ہے جتنا اسلام، اور جو لوگ اس کی اہلیت نہیں رکھتے، ان کا اہل لوگوں کا اتباع/تقلید کرنا اتنا ہی قدیم ہے، جتنا اسلام۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ عہد صحابہ میں حضرت علی یا حضرت معاذ بن جبل یا کسی دوسرے ذی علم و تدبر صحابی نے کوئی رائے قائم کی اور دوسرے صحابہ نے ان کا اتباع کیا۔ مثال کے طور پر قرآن نے شراب کو حرام کر دیا۔ لیکن حکم حرمت کے باوجود اگر کوئی شراب پیتا ہے تو اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ کتاب اللہ میں موجود نہیں ہے۔ حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں مشورہ کیا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اس کی سزا اخف الحدود رکھی۔ یعنی شریعت میں جتنی حدود ہیں ان میں اقل مقدار حد قذف (اسی کوڑے) ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن نے کتاب اللہ میں حد کے نظیر

تلاش کی اور سب سے خفیف قذف میں پایا، اس لیے اسی کو شراب نوشی کی حد بھی قرار دیا، کیوں کہ اس سے کم کتاب وسنت میں کوئی حد ہی نہیں۔ صحابہ نے اس رائے کو تسلیم کرلیا۔ تو عمومی معنی میں اسے حضرت عبدالرحمٰن کا اجتہاد اور صحابہ کی تقلید کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اسی کو حضرت عمرؓ نے مقرر مان لیا اور اپنے سارے گورنروں کو لکھ بھیجا کہ شرابی کو اسی کوڑی لگائے جائیں۔

اجتہاد کا وہ معنی جس میں فقہ القرآن والسنۃ کو ایک علمی و اصولی فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے یہ نہ تو زمانہ رسالت میں تھا اور نہ عہد صحابہ میں۔ اس کا آغاز امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ بعد میں دوسرے درجنوں ذی علم و ذی تدبر حضرات نے بھی اس معنی میں اجتہاد کی۔ فقہ الکتاب والسنۃ کے لیے باضابط اصول وضع کیے گئے اور ان اصول کی روشنی میں کتاب وسنت سے غیر منصوص مسائل کا حکم معلوم کرنے کا طریقہ بھی واضح ہوگیا اور خود منصوص مسائل کو بھی نص سے علمی انداز سے ثابت کرنا آسان ہوگیا۔

حضرت امام ابوحنیفہ کی ولادت ۸۰ھ میں اور وفات ۱۵۰ ہجری میں ہوئی۔ اس سے فن اجتہاد کا آغاز کس صدی میں ہوا واضح ہو جاتا ہے۔ جب امام ابوحنیفہ نے یہ کام شروع کیا تو جو لوگ حدیث کی تلاش وجستجو میں مصروف تھے، ان میں بعض نے اپنے طور پر اسے بہت زیادہ پسند نہیں کیا۔ اس لیے کے عام طور پر جو آدمی جو کام کرتا ہے، اسی کو سب سے اہم کام سمجھتا ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی رہی ہو کہ بعض حضرات نے اس اجتہاد کو فقہ القرآن والسنۃ کے علمی اصول کی بجائے کتاب وسنت کے مقابل کوئی اور چیز سمجھا ہو۔ بہرحال باوجود اس کے بہت سے جلیل القدر ذی علم، ماہرین کتاب وسنت اور واقفین رموز شریعت نے اس میدان میں قدم رکھا۔ فنی طور پر ان میں اختلاف ہوا اور مختلف مکاتب فقہ وجود میں آئے۔

چار مکاتب آج بھی موجود ہیں۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی۔ اور امام اوزاعی وغیرہ کے مسالک باقی نہیں رہ سکے۔ کیوں کہ وہ مدون نہ ہوسکے اور مدون نہ ہونے کی وجہ غالباً یہ ہو کہ ان کے اصول بعد کے اہل علم میں مقبول نہیں ہوسکے۔ جن کے اصول متاخرین میں سے جتنے زیادہ اور جتنے بڑے اصحاب علم و دانش نے پسند کیا، ان کا مسلک فقہی اسی اعتبار سے پروان چڑھتا رہا۔ یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تقلید شخصی کا مفہوم یہ نہیں کہ کتاب وسنت کو چھوڑ کر کسی

امام کو مصدر شریعت مان لیا جائے یا کتاب وسنت کی طرح قول امام کو بھی مصدر شریعت کا درجہ دے دیا جائے۔ اس طرح کی تقلید یقیناً تقلید جامد بلکہ اشراک فی الدین ہے۔ اہل علم و بصیرت کے لیے تقلید کا فقط یہ معنی ہے کہ انھیں کسی ایک امام کے اصول پسند ہیں اور وہ ان اصولوں کی پیروی کرتا ہے۔ اس مفہوم میں غیر مقلدین حضرات بھی اپنے ان بڑوں کے مقلد ہیں جنھوں نے اپنے طور پر علم و استدلال کی روشنی میں تقلید کو غلط قرار دیا۔ اس کے لیے انھوں نے جو دلائل پیش کیے وہ دلائل ان کے تمام متبعین کے ذہن وفکر میں بھی اتر گئے۔ اس لیے یہ حضرات بھی اپنے بڑوں کی بات دہرانے لگے۔ مقلدین اہل علم کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اپنے امام کو اس لیے نہیں مانتے کہ خدا و رسول کی طرح ان کے ارشادات بھی مستند ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ امام نے جو بات کہی ہے وہ منشا کتاب وسنت کو پوری کر رہی ہے۔ رہے عوام یا جنھیں دین کا شعور نہیں وہ تو اہل الذکر سے معلوم کریں گے ہی۔ انھیں اہل علم کے اتباع/تقلید سے بہر حال چارہ کار نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مخصوص معنی (اصول سازی) میں اجتہاد کی ضرورت کیوں پڑی؟ اس سوال کا جواب ہمیں دو مثالوں سے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ہمارے سامنے اس وقت ایک مثال بدھ مذہب کی دو خانوں مہایان اور ہنایان میں تفریق ہے اور دوسری مثال ہے علم شریعت کی، ذیلی علوم علم تفسیر، علم حدیث، علم اصول، علم کلام وغیرہ میں تقسیم۔

(۱) گوتم بدھ ۵۶۳ھ ق م میں ایک چھتری حکمراں خانوادے کے اندر نیپال میں پیدا ہوئے۔ ۲۹/سال کی عمر میں تلاش حق کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں میں گم ہوگئے، ۳۵/سال کی عمر میں بدھ مت کے مطابق انھیں نروان (نجات) حاصل ہوگیا اور بقیہ زندگی کے ۴۵ سال اپنی فکر کی تبلیغ واشاعت میں گزار دیے۔ گوتم بدھ کی وفات کے ۱۰۰/سال بعد بنارس میں ان کے متبعین (بھکشوؤں) کا ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں باضابطہ بدھ مت کو ایک مذہب کی شکل دے دی گئی اور اس کے ساتھ ہی بدھ بھکشوؤں میں روایت و جدت کے حوالے سے اختلاف ہوگیا۔ ایک وہ طبقہ تھا جو گوتم بدھ کے الفاظ پر عمل کرنے کا مطالبہ کرتا تھا اور ذرہ برابر اس سے ہٹنے کو بدھ مت سے ارتداد سمجھتا تھا، جبکہ دوسرا طبقہ گوتم بدھ کے مقاصد، ان کے ارشادات کے معانی و مفاہیم اور نئے دور اور نئے مسائل میں ان کے ارشادات کی توضیح وتطبیق کا قائل تھا۔ روایت پرستوں کا

نمائندہ ہنایان اور آزاد خیالوں کا نمائندہ مہایان کی شکل میں آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔

اس تناظر میں مسلمانوں کے اندر مقلدین و غیر مقلدین کے اختلافات پر نظر ڈالیے تو ان کا سرا اصحاب اجتہاد اور اصحاب ظواہر پر ختم ہوتا ہے۔ یعنی اصل اختلاف یہ نہیں ہے کہ اہل علم کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے۔ اہل علم سے دریافت کرنا اور ان کی رہنمائی پر عمل کرنا یہ تو قرآن سے ثابت ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی کلمہ خواں کو اس مسئلہ میں اختلاف ہوگا۔ اصل اختلاف یہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے اب تک جو سمجھا ہے وہ یہی ہے کہ بدھ مت کے ماننے والوں کی طرح بنیادی طور پر یہی نقطہ اختلاف مسلمانوں میں بھی پیدا ہوگیا۔ کچھ اہل علم کی رائے یہ بنی کہ قرآن و حدیث کو کافی سمجھا جائے اور جتنی باتیں ان میں ہیں انھیں پر عمل کیا جائے۔ جبکہ دوسرے طبقے کو نئے دور اور نئے مسائل کا اندازہ تھا اور اس نے یہ سمجھا کہ نئے مسائل اتنے زیادہ اور اتنے مختلف النوع پیدا ہو رہے ہیں کہ ان کے لیے حل مسائل کا علاحدہ اور مخصوص شعبہ قائم کرنا ضروری ہے۔ ان کے لیے باضابطہ اصول وقوانین وضع کیے بغیر اسلام نئے چیلنجز کا نہ تو جواب دے سکتا ہے اور نہ ہی مسائل شریعت کو جدید علمی انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ بنیادی اختلاف ہے جس پر سب کی نظر نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے میں اپنے محدود ومختصر مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان دونوں نظریات میں صحیح کیا ہے؟ اس میں ہمارا اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن اس میں ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں نظریات نیک نیتی پر مبنی ہیں۔ اگر ان نظریات کے متبعین بھی نیک نیتی پر گامزن ہوں تو عند اللہ وہ ضرور ماجور یا معذور ٹھہریں گے۔

(۲) عہد رسالت میں ایک منبع علم تھا، سرچشمۂ رسالت۔ اس سے جو جتنا سیراب ہوتا وہ اتنا ہی بڑا عالم شریعت ہوتا۔ اس زمانہ میں نہ کوئی مکتب تھا، نہ مدرسہ، نہ علم حدیث نہ علم تفسیر، نہ قرآن الگ، نہ حدیث الگ۔ سب شہر علم وحکمت کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور علم وفن کے موتی اپنے دامن میں سمیٹے واپس ہوتے۔ علم دین میں تھوڑی سی تفریق بس یہ تھی کہ تاجدار اقلیم رسالت صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کی نشاندہی فرماتے اور کاتب بلوا کر اسے لکھوا دیتے۔ لیکن مجموعی

طور پر صحابہ کے پاس ایک علم تھا اور وہ تھا علم شریعت، یہ اور بات ہے کہ وہی تمام علوم وفنون کو جامع تھا۔ ایک ہی صحابی حافظ و قاری بھی تھا۔ محدث وفقیہ بھی اور مجتہد ومتکلم بھی۔ علمی اعتبار سے صحابہ میں کمی وبیشی ضرور تھی۔ لیکن ان میں اسپیشلائزیشن کا کوئی باضابطہ تصور نہیں تھا۔

خلافت راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا عہد آیا اور رسالت کا زمانہ کافی پیچھے چھوٹ گیا، مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست روشنی حاصل کرنے والے ایک ایک کرکے کم ہونے لگے تو اب علم شریعت کو مدون کرنے کا رجحان اور تدوین کے لیے، تخصص، تفنن اور ترتیب کا شعور پیدا ہوا۔ کچھ نفوس قدسیہ نے جمع حدیث کا کام کیا، کچھ نے نقد حدیث کا کام یا، بعض محسنین امت نے ماثور تفسیریں لکھیں، کچھ نے رجال حدیث کے احوال جمع کیے۔ اسی زمانے میں قانون اسلامی ایک علاحدہ فن کی حیثیت سے سامنے آیا اور علم فقہ واصول کی وضع ہوئی۔ یہ ساری چیزیں بدعت تھیں، لیکن بدعت ہوتے ہوئے یہ امت کی ضرورت تھیں اس لیے امت کی نمائندہ شخصیتوں نے پورے انہماک اور لگن سے یہ کام انجام دیا۔ آج اگر ہم کہیں کہ کتاب وسنت کے بعد ساری چیزیں بدعت ہیں جن کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ تو یہ سوال صرف فقہ واجتہاد پر نہیں ہوگا بلکہ اس سوال سے دین کا سارا سرمایہ خطرے کی زد میں آجائے گا۔

اس گفتگو سے اس طرح کے شبہات ختم ہو جاتے ہیں کہ کیا امام بخاری مجتہد نہیں تھے؟ اور کیا امام ابوحنیفہ محدث نہیں تھے؟ اس طرح کے شبہات انہی ذہنوں میں آسکتے ہیں جن میں تخصص اور اسپیشلائزیشن کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ اس طرح کے شبہات میں ڈوب کر جو فکری ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، انھیں دور جدید میں علوم میں اسپیلائزیشن کا مفہوم کیا ہے؟ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، جسے بدقسمتی سے مغرب کی دین سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر آج کوئی سیاسیات کا اسپیشلسٹ ہے تو اس کا بالکل یہ معنی نہیں کہ وہ سماجیات، عمرانیات اور تاریخ سے نابلد ہے اور نہ کوئی تاریخ کا ماہر سیاسیات سے نابلد ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود خصوصی موضوع کے خصوصی مطالعہ کے سبب اس موضوع کے حوالے سے جو وسعت علم ہوتی ہے وہ دوسرے موضوع کے حوالے سے نہیں ہوتی۔

اسپیشلائزیشن کے مفہوم کو سمجھنے کے بعد یہ بات بھی سمجھ میں آجانی چاہیے کہ امام

بخاری یا دوسرے ائمہ حدیث کا میدان فکر وعمل کچھ اور ہے اور امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ اجتہاد کا میدان عمل کچھ اور۔

ازروئے تخصص علم حدیث وعلم فقہ کا معنی جب تک ذہنوں میں واضح نہیں ہو جاتا، اس وقت تک امام بخاری و امام ابوحنیفہ میں تفصیل، علماء حدیث اور علماء فقہ میں تفضیل، علمائے حدیث کی تقلید کرنے کا مطالبہ اور اس طرح کے شکوک وشبہات ختم نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ تخصص کا مفہوم نہیں سمجھتے ہم انھیں معتوب کرنے کی بجائے دعا دینے کے خواہاں ہیں۔ کیوں کہ وہ یقینی طور پر دعاؤں کے مستحق ہیں۔

کیا آج ائمہ مجتہدین کی تقلید کرنی چاہیے؟

عہد حاضر کے نامور فقیہ علامہ غلام رسول سعیدی (پاکستان) فرماتے ہیں:

آج کل ہمارے زمانے میں دو قسم کے مقلد ہیں، ایک تو عوام ہیں جو امام کے محض مقلد ہوتے ہیں اور ایک وہ علماء ہیں جو فقہی مسائل اور ان کے دلائل پر بصیرت رکھتے ہیں اور مسائل عصر یہ کا حل کتاب وسنت اور اصول کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں۔ پہلی قسم کے مقلد صرف تقلید کرتے ہیں اور دوسری قسم کے مقلد امام کی اتباع کرتے ہیں۔ تقلید کے معنی ہیں دلائل سے قطع نظر کر کے کسی امام کے قول پر عمل کرنا اور اتباع سے یہ مراد ہے کہ کسی امام کے قول کو کتاب وسنت کے موافق پا کر اور دلائل شرعیہ سے ثابت جان کر اس قول کو اختیار کر لینا۔ سو تقلید صرف عوام کے لیے ہے جو دلائل شرعیہ سے بے خبر ہوتے ہیں اور اہل علم اور اہل فتویٰ حضرات کے لیے تقلید محض جائز نہیں ہے۔ (شرح صحیح مسلم ۶۴/۵)

الفاظ کے اختلاف کے ساتھ عوام بلاشبہ مقلد یا متبع ہیں۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اصل اختلاف اہل علم کے تقلید کرنے یا نہ کرنے میں ہے۔ پھر یہ کہ تقلید فروع میں کریں؟ یا اصول میں کریں؟ یا دونوں میں کریں؟ علامہ سعیدی کے مذکورہ خیال کہ ''علماء امام کی اتباع کرتے ہیں'' کا تجزیہ کرنے اور اس کے مضمرات پر گہرائی سے سوچنے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی عالم

کے حنفی یا شافعی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کو امام شافعی یا امام ابوحنیفہ کے اجتہاد کردہ مسائل کتاب وسنت کے موافق نظر آرہے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی حنفی کو امام ابوحنیفہ کے ہی تمام مسائل کتاب وسنت کے موافق نظر آتے ہیں اور کسی شافعی کو صرف امام شافعی کے تحقیق کردہ مسائل ہی کتاب وسنت کے موافق نظر آتے ہیں؟ جہاں تک دلائل کی بنیاد پر علماء کے اتباع کرنے کی بات ہے تو ہونا تو یہ چاہیے کہ انھیں بعض دلائل امام ابوحنیفہ کے مستحکم نظر آئیں اور بعض امام شافعی کے اور اگر بات ایسی ہوتو پھر تقلید شخصی کا قصہ افسانہ بن جائے۔

مزید غور کرنے کے بعد یہ عقدہ کھلتا ہے کہ مقلدین علماء، اصول میں اپنے ائمہ کی تقلید کرتے ہیں اور فروع میں اتباع کرتے ہیں۔ اصول میں تقلید کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ذہن فطری طور پر ایسا واقع ہوا ہے کہ اسے کسی ایک امام کے اصول ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسائل میں وقت ضرورت دوسرے مسلک فقہی پر فتویٰ دینے کے باوجود وہ کسی ایک ہی مسلک کے پابند سمجھے جاتے ہیں۔

واقعہ دراصل یہ ہے کہ دنیا میں اصولی ذہن بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ شیخ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر تقلید کا رد کیا۔ آج تک جتنے غیرمقلدین ہیں تقریباً سب کے سب معمولی اختلاف کے ساتھ انہی کے اصول و اسلوب کی پیروی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ سب کے سب ''اصول نقد تقلید'' میں ابن حزم کے مقلد ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیرمقلد کا معنی یہ نہیں رہا کہ وہ ہر مسئلہ میں تمام علماء کے اقوال و اختلافات کا تجزیہ کرکے اپنی رائے قائم کرے۔ بلکہ غیرمقلدیت ایک مستقل فقہی مسلک کی شکل اختیار کرگئی۔ آج جتنے غیرمقلدین ہیں ان کے سر میں جہاں تقلید کی مخالفت کا سودا سوار ہے وہیں داؤد ظاہری، شیخ ابن حزم، شیخ ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی کی عظمت علم اور سطوت قلم کا جنون بھی۔ اس طرح جیسے سارے مقلدین فقہی سطح پر ایک نکتے پر جمع تھے غیرمقلدین بھی تقلید کی مخالفت کرتے ہوئے ایک تقلیدی پلیٹ فارم پر آگئے۔ اب جو سوال مقلد علماء پر تھا، ٹھیک وہی سوال غیرمقلد علماء پر ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ان کو ابن حزم، ابن تیمیہ اور ابن قیم کی

تحقیقات ہی کتاب وسنت کے موافق نظر آتی ہیں۔ اگر وہ غیر مقلد ہیں تو ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ بعض مسائل میں شیخ ابن تیمیہ کے ساتھ رہیں اور بعض دوسرے مسائل میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ۔ اور یہ کہ ایک غیر مقلد ایک ہی مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کی موافقت کرے اور دوسرا غیر مقلد عالم اسی مسئلہ میں اس کی مخالفت کرے۔

اس پوری گفتگو سے معلوم یہ ہوا کہ اہل علم نے اصول میں ائمہ اربعہ کی تقلید کی اور یہ اس لیے نہیں کہ انھوں نے آنکھ بند کرکے ان کے فرمان کو کتاب وسنت کی طرح تسلیم کرلیا۔ بلکہ اس لیے کہ ان کی ذہنی ساخت ہی کچھ ایسی تھی جسے کسی ایک امام کے اصول ہی پسند آئے۔ اصول اور اصولی ذہن کی قلت کوئی حیرت انگیز چیز نہیں۔ اسے گہرائی میں اتر کر سمجھا جاسکتا ہے۔

عصر حاضر میں اجتہاد کی صورت

جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں معلومات کے دریا کے ساتھ مسائل کا سمندر بھی جاری کر دیا جس کا تموج ہر اگلے عشرے میں دگنا یا اس سے بھی زیادہ ہوتا چلا گیا، اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ دنیا کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ بڑی تیزی سے بدلنے لگا، آج ہر آن ایک نقش ڈوبتا ہے تو دوسرا ابھرتا ہے۔ اس کی ایک محسوس مثال یہ ہے کہ جو حضرات پچھلے پچاس سالوں سے تصویر سازی اور ویڈیو گرافی کی شدید مذمت کرتے آرہے تھے، آج اچانک ایسے تصویری سحر کا شکار ہوگئے کہ وہ خود کو وسط سمندر میں تصور کر رہے ہیں جہاں سے دونوں کناروں کی مسافت برابر ہے۔ ایسے میں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ رخ کس کا کریں۔ اسی اضطراب کا نتیجہ ہے کہ ابھی میڈیا، صحافت اور تصویر کی تباہ کاریوں پر لیکچر دیتے ہیں اور چند لمحے بعد ہی میڈیا کی اہمیت وضرورت کا احساس انھیں کیمرے کے سامنے کھینچ لاتا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ اپنے گردو پیش کا جائزہ لیجیے تو اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس گومگو کی کیفیت کے سبب عوام وخواص، عالم و جاہل، ہر کس و ناکس تقلید و اجتہاد کے موضوع پر مہذب یا غیر مہذب الفاظ میں اظہار خیالات کرنے کی جرأت و جسارت کرنے لگا ہے۔ یہ بحث غلو کی شکل اس وقت اختیار کرلیتی ہے جب کمزور دماغ مغلوبیت میں اباحیت پسندی کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے نزدیک ہر مسئلہ میں اجتہاد ضروری ہے اور اجتہاد کا صرف یہ معنی ہے

کہ ماضی کے علماء نے جتنی باتوں کو نا جائز وحرام لکھا ہے ان سب کو بہ یک جنبش قلم مباح قرار دے دیا جائے۔

اس افراط کے برعکس تفریط کا یہ عالم ہے کہ کسی مسئلہ پر عصری تناظر میں نظر ثانی کو ارتداد فکری، نفس پرستی اور آزاد روی بمعنی الحاد و لادینی کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ تقلید جامد کا یہ عالم کہ کسی کو بھی یہ اجازت نہیں کہ وہ کسی مسئلے میں اپنے سابق عالم سے علم واستدلال کی روشنی میں اختلاف کرے، یا بوجہ ضرورت اصل حکم کا اعتراف کرتے ہوئے اس میں دوسرا حکم صادر کرے۔ اس کا ایک شدید نقصان یہ ہے کہ نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں، عوام ان میں علماء کی رہنمائی کا انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر اپنی مرضی کی راہ نکال لیتے ہیں، جبکہ اہل علم تحت السوال جواب دینے کے لیے ان کے استفتے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اجتہادی جمود اور تقلیدی مزاج کی انتہا اور کیا ہوسکتی ہے کہ جب میں نے ایک عالم دین کے سامنے شہری زندگی گزار رہے مسلمانوں کے کچھ مسائل کا ذکر کیا تو انھوں نے صاف طور پر فرما دیا کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد گاؤں اور دیہاتوں میں بستی ہے اور حکم ہمیشہ اکثریت کے حالات کو مدنظر رکھ کر لگایا جاتا ہے، اس لیے ہم شہری زندگی کی مشکلات کا اعتبار نہیں کرسکتے۔

اجتہاد اپنے آپ میں ایک متعدد المفاہیم لفظ ہے، جس کی وضاحت ہم پیچھے کر چکے ہیں، اس کی وجہ سے ہوتا یہ ہے کہ جب عصر حاضر کے تناظر میں اجتہاد پر گفتگو کی جاتی ہے تو کسی ایک معنی کے تعین کیے بغیر ہی معرکہ بحث ونظر گرم ہو جاتا ہے۔ جس کا اختتام بلانتیجہ ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں ممکنہ طور پر عصر حاضر میں اجتہاد کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں (آپ چاہیں تو اسے اجتہاد کی بجائے کسی اور لفظ سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں) (۱) نو پیدا مسائل میں اجتہاد (۲) علمائے متقدمین کے مجتہد فیہ مسائل میں نئے حالات کے پیش نظر از سر نو تدبر (۳) فقہی اصول میں اجتہاد۔ ہم ذیل میں ہر ایک کے تعلق سے مختصراً عرض کیے دیتے ہیں، خدا! رہوار قلم کو جادۂ مستقیم پر گامزن رکھے۔ بصورتِ دیگر اہل علم اس کی نشاندہی کریں ہم دل و جان سے ان کے شکر گزار ہوں گے۔

نو پیدا مسائل میں اجتہاد

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ کتاب و سنت نے ضروری اور بنیادی احکام بیان کردیے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ان میں قیامت تک آنے والے ہر مسئلہ کا علاحدہ حکم بیان کر دیا جاتا، ہاں تمام مسائل کے لیے اصول پیش کر دیے گئے اور انہی اصول کی روشنی میں مسائل کو حل کرنے کا حکم دے دیا گیا، اس کے لیے قرآن و حدیث میں بے شمار دلائل موجود ہیں اور میری دانست کی حد تک کسی ذی علم نے بھی اس اجتہاد کا انکار نہیں کیا ہے۔ اس معنی میں اجتہاد عہدرسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین میں بھی ہوا، بعد کے ہر دور میں بھی ہوا، چوں کہ نئے مسائل ہر دور میں پیش آتے رہے، آج بھی نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اس لیے لازمی طور پر آج میں بھی اجتہاد کیا جائے گا۔ یہ اجتہاد نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔ تمام علماء پر فرض کفایہ ہے کہ وہ نئے مسائل کا حکم بتا کر امت کی رہنمائی کریں، اور یہ فرض کفایہ اس وقت فرض عین ہو جاتا ہے جب کسی خاص عالم دین (جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو) کے سامنے اس کے تعلق سے استفسار کردیا جائے۔

نئے مسائل کا جواب دینے میں عموماً عہد حاضر کے ارباب علم وفتویٰ مسائل کے الفاظ کو سامنے رکھ کر ''اگر مگر'' کے ساتھ جواب دیتے ہیں، جب کہ جدید مسائل کا حل بتانے کا یہ مجتہدانہ طریقہ نہیں ہے۔ کیوں کہ نئے مسائل میں سائل ایک ہوسکتا ہے پر وہ مسئلہ عمومی طور پر سب کے لیے ہوتا ہے اس لیے نئے مسائل کا جواب دینے میں صحیح طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ سائل کے الفاظ کے پیچ وخم میں الجھنے کی بجائے۔ حالات کا غائرانہ جائزہ لیا جائے اور ایک عمومی جواب دیا جائے۔ پچھلے دنوں ''چاؤمین'' کے تعلق سے ایک فتویٰ ہماری نظر سے گزرا۔ سائل نے یہ دریافت کیا تھا کہ سننے میں آیا ہے کہ چاؤمین میں جو پاؤڈر استعمال کیا جاتا ہے اس میں سور کی ہڈی شامل ہوتی ہے، ایسی صورت میں چاؤ مین کھانے کا کیا حکم ہے؟ مفتی صاحب نے یہ جواب دیا کہ اگر چاؤمین میں سور کی ہڈی پڑتی ہو تو اس کا کھانا حرام ہے ورنہ جائز ہمیں بتایا جائے کہ کیا سائل کو اس فتوی سے کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جو اسے پہلے معلوم نہ تھی، آج عام انسانوں کے پاس بالکل وقت نہیں کہ وہ ہر چیز کے بارے میں تحقیق کریں، نہ یہ ان کی ذمہ داری ہے، غضب تو یہ

البينة على المدعي واليمين على من انكر ☆ گواہ لانا مدعی کے ذمہ اور قسم منکرِ دعوی کے ذمہ ہے۔

ہے کہ اس عدیم الفرصتی نے ان کے اندر اباحیت پسندی کا مزاج پیدا کر دیا ہے، لیکن ایسے وقت میں بھی اگر کوئی شرعی حکم دریافت کرتا ہے تو کیا ''اگر مگر'' سے جواب دے دینے سے جدید مسائل میں حق جواب ادا ہو جاتا ہے؟

عصر حاضر کے نو پیدا مسائل کے حل میں دو بڑی اہم دشواریاں یہ ہیں کہ ایک تو جدید مسائل اتنی عجیب وغریب نوعیت کی حامل ہیں کہ ان میں جواز وعدم جواز کسی ایک جانب کو ترجیح دینا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ نیز حل مسائل کا جو ایک عمومی طریقہ ہے کہ اگر کوئی جدید مسئلہ کتاب و سنت میں منصوص نہیں ہے تو اس کے لیے فقہاء فقہائے متقدمین کے یہاں کوئی جزیہ تلاش کرتے ہیں، موجودہ مسائل میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماضی کے فقہاء کے یہاں کوئی نظیر یا جزیہ نہیں ملتا جس کی وجہ سے براہ راست از سر نو تدبر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی مثال ممالک یورپ امریکا کو دارالاسلام، دارالحرب، دارالامن، دارالخوف یا دارالدعوہ کہنے کا مسئلہ ہے۔

جدید مسائل کے حل میں ایک دوسری بڑی دشواری یہ ہے کہ عصر حاضر کے علماء میں جس طرح علوم اسلامیہ پر گہری نظر، وسعت مطالعہ، ژرف نگاہی، قوت تدبر اور دولت تفقہ کی ضرورت ہے وہ ناپید ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ تقلیدی مزاج نے عموماً اہل علم کو ہل من مزید کی طلب سے آزاد کر دیا ہے، یہ مشکل جدید مسائل کے حل میں خاصا مشکل پیدا کر دیتی ہے۔ ویسے عصر حاضر کے علماء نے جدید مسائل کے حل کے لیے جو اجتماعی طریقہ نکالا ہے اس نے مذکورہ بالا دشواریوں کو کافی حد تک کم کر دیا ہے، اس طرح کا طریقہ خود امام اعظم ابوحنیفہ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے حل مسائل میں بیک وقت کئی دماغ کام کرتے ہیں اور خطا کا احتمال کم سے کم رہ جاتا ہے۔ یہ بہت ہی بہتر طریقہ ہے، بشرطیکہ فقہائے عصر اس طرح کی مجلسوں میں اپنے تفقہ اور مطالعہ کی روشنی میں حل مسائل کے قصد سے جائیں نہ یہ کہ صرف اپنے بڑے عالموں کے فیصلے سننے کے لیے۔ علاوہ ازیں جدید مسائل میں انفرادی تدبر وتفکر کا طریقہ بھی غلط نہیں، امت کے جو اصحاب علم اس کے اہل ہوں وہ انفرادی طور پر بھی تحقیق و اجتہاد کریں، اس مہربانی کے ساتھ کہ اپنی انفرادی رائے کو امت پر مسلط کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے اسے اپنے لیے تو وجب العمل سمجھیں لیکن دوسروں کو ان کے اجتماعی

موقف پر قائم رہنے دیں۔

مجتہد فیہ مسائل پر نظر ثانی

مجتہد فیہ مسائل پر نظر ثانی کا یہ معنی نہیں کہ متقدمین کے تمام تحقیقات و فتاویٰ پر از سرنو اجتہاد کرنے کے لیے بیٹھا جائے، یہ تو تضیع اوقات اور حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نیز اس میں اکابر و اسلاف امت کے ساتھ سخت بدگمانی ہے جبکہ ہمیں عام مسلمانوں کے ساتھ حسن ظن رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مجتہد فیہ مسائل پر نظر ثانی کرنے کا صرف یہ معنی علم اور حسن ظن کے تقاضے پورے کرتا ہے کہ اگر متقدمین کی کوئی تحقیق آج کسی بھی طرح زیر بحث آجائے تو اس پر غیر جانب دارانہ علمی اسلوب میں غور وفکر کیا جائے نہ یہ کہ اسلاف کا قول ہونے کی وجہ سے اسے آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا جائے۔آج اس کی دوصورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ فقہائے متقدمین نے جو فیصلے دیے ہیں ان سے اتفاق کرتے ہوئے بوجہ ضرورت ان میں دوسرا حکم صادر کیا جائے۔ اور دسری یہ کہ خود ان کے فیصلے سے اختلاف کرلیا جائے۔ پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ قرآن حکیم نے مصارف صدقات میں تالیف قلب کو بھی شامل رکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مال زکوٰۃ غیرمسلموں پر بھی خرچ کیا جائے تاکہ ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہو اور وہ اسلام سے قریب ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک منصوص مسئلہ ہے جس کا انکار کفر کے ہم معنی ہے، لیکن حضرت فاروق أعظم نے اپنے عہد خلافت میں اسے موقوف کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ قرآن سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، یا انھوں نے حکم قرآنی کی مخالفت کی، بلکہ اس لیے کہ جس مقصد کے لیے قرآن نے اس کا حکم دیا تھا وہ مقصد اب باقی نہیں رہا، اگر آج بھی بالفرض اس کی ضرورت ہو تو اس پر مال زکوٰۃ صرف کیا جاسکتا ہے۔ یہ منصوص مسائل میں احوال عصر کے بدلنے سے حکم شریعت میں تبدیلی کی مثال ہے۔ غیرمنصوص مسائل میں اس کی مثال یہ ہے کہ علمائے احناف کے نزدیک اصل حکم یہ ہے کہ مفقود الخبر شوہر کی بیوی ۸۰رسال تک انتظار کرے گی، حنفی علمائے متاخرین نے اس سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ اصل حکم کا اعتراف کرتے ہوئے حالات اور یسر کے پیش نظر امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا اور مدت انتظار فقط ۴رسال رکھا، اس کی دوسری واضح مثال تصویر سازی کا مسئلہ ہے۔ ماضی قریب کے علماء نے اسے ناجائز وحرام لکھا، موجودہ علماء بھی اسے ناجائز وحرام

قرار دیتے ہیں مگر بوجہ ضرورت اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس سلسلے میں ضرورت کا تعین ابھی مختلف فیہ ہے۔

مجتہد فیہ مسائل میں اس معنیٰ میں اجتہاد نہ تو شاذ و نادر ہے اور نہ ہی باعث حیرت و استعجاب۔ اس لیے عصر حاضر میں کوئی ذی علم اور صاحب استعداد اگر اس طرح کا اجتہاد کرتا ہے تو صرف اس لیے اس کی مخالفت نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے متقدمین سے اختلاف کر رہا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات کا گہرا تجزیہ اور ضرورت کا تعین وسیع علم، پختہ فکر اور عمیق تفقہ کا تقاضا کرتا ہے، اس لیے بلاوجہ اس راہ پر خار میں ہر کوئی قدم رنجہ فرمائی کی زحمت نہ کرے۔

متقدمین سے اختلاف کی دوسری صورت یعنی علمی طور پر اختلاف یہ عقلاً بھی جائز ہے اور ہمارے سامنے اس کی کئی ایک مثالیں بھی موجود ہیں۔ عقلاً جواز کی وجہ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا امام بہرحال بشر تھے اور بشر سے امکان خطا ایک اتفاقی مسئلہ ہے، حضرت امام مالک فرماتے ہیں:

انما انا بشر أخطی واصیب فانظر وا فی قولی فکل ماوافق الکتاب والسنة فخذوا به و مالم یوافق الکتاب والسنة فاترکوه.

میں بشر ہوں، میری رائے درست و نادرست دونوں ہوسکتی ہے، میری باتوں میں غور کرو، جو ان میں کتاب وسنت کی موافق ہوں، ان پر عمل کرو اور جو موافق نہ ہوں انھیں چھوڑ دو۔

متقدمین سے علمی اختلاف کی ایک مثال ماہ شوال کے بعد چھ نفلی روزے رکھنے کا مسئلہ ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ کہا تھا اور متاخرین نے حدیث صحیح ملنے کے بعد اس کے استحباب کا قول کیا۔ پاکستانی فقیہ ومحقق علامہ غلام رسول سعیدی نے اسی نوعیت کا اختلاف کتابت نسواں کے مسئلے میں کیا ہے، متقدمین علماء نے جن احادیث کی بنیاد پر کتابت نسواں کو ناجائز لکھا تھا انھوں نے ان احادیث کی صحت کا انکار کرتے ہوئے جواز کے حوالے سے احادیث پیش کر دیے، اس طرح کے اختلافات اور بھی ہیں، اگر ان اختلافات کے پیچھے نیت صالح ہو تو ان کی حیثیت بھی وہی ہے جو دیگر اجتہادی اختلافات کی ہے، لیکن باوجود ایں ہمہ اسلاف کے

اندر یقینی طور پر فقہ و تدبر اور علم القرآن و السنۃ زیادہ تھا، اس لیے اس طرح کے اختلافات کی گنجائش کم سے کم ہے، کیوں کہ اسلاف نے بڑی جاں فشانی اور کمال احتیاط سے فتاوے صادر کیے ہیں، ہمیں ان سے حسن ظن رکھنا چاہیے تاہم حسن ظن کا یہ معنی نہیں کہ علمی طور پر ان کے خلاف حق روشن ہو جائے جب بھی ہم دلیل کو نظر انداز کر کے شخصیت سے چمٹے رہیں۔

علمی اختلاف کی بات آہی گئی تو یہاں اس نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جو حضرات اسلاف سے علمی اختلاف کے جواز کے قائل ہوتے ہیں وہ خود اپنے نظریے اور رائے سے اختلاف کو نہیں معلوم کس دلیل سے یکسر غلط سمجھتے ہیں۔ وہ جب خود اختلاف کرتے ہیں تو مسائل میں توسع، خطائے بشری کا احتمال اور الحق احق ان یتبع کی دہائی دیتے ہیں لیکن جب دوسرے ان سے اتفاق نہیں کرتے تو وہ آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔ جماعت غیر مقلدین کا بالعموم رویہ یہی ہے اور یہ زہر البانی کے مزاج میں کچھ زیادہ ہی سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تراویح میں بیس اور آٹھ رکعت کا نزاع جو زیادہ سے زیادہ استحباب یا سنت کی نوعیت کا تھا اسے وجوب کا درجہ دے دیا۔ اور بیس رکعت پڑھنے کو جو عامۃ الصحابہ کے عمل سے ثابت ہے نہ صرف مرجوح بلکہ نا جائز قرار دے کر دم لیا۔

انصاف یہ ہے کہ ہر عالم جس کے اندر مجتہدانہ علم و شعور ہو، کو علمی سطح پر اپنے پیش رو عالم سے اختلاف کا حق ضرور ہے، لیکن دوسرے علماء کو بھی اس سے اختلاف یا اتفاق کرنے کا حق ہے۔ اگر کسی نے دلائل سے اپنے پیش رو عالم سے اختلاف کیا اور دوسرے معاصر عالم نے دلائل کی روشنی میں ہی اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تو اسے اتفاق کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی اس کے اختلاف کو تقلید جامد یا اسلاف پرستی کا نام دیا جاسکتا ہے، کیوں کہ ایسا کرنا اسلاف پرستی سے روکنے کی بجائے خود اپنی شخصیت پوجنے کی دعوت دینا ہے۔

فقہی اصول میں اجتہاد

عالم عرب کے معروف اسکالر شیخ یوسف قرضاوی وغیرہ نے عصر حاضر میں ''تجدید اصول فقہ'' کی بحث چھیڑی ہے، یہ بحث جہاں شرعی حدود و قیود سے آزاد رہ کر مسلمان بنے رہنے کے متمنی افراد کے لیے ایک شادیانہ مسرت سے کم نہیں وہیں امت کے ذمہ دار، اسلام کے درمند

اصحاب فقہ و افتا کے لیے یہ دعوت فکر ونظر بھی ہے۔ ان جدید اجتہادیوں کی رائے یہ ہے کہ اصولِ فقہ دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو نص قرآنی کی تفہیم کے لیے بنائے گئے ہیں جیسے الامر للوجوب امر مطلق و جوب کے لیے ہے۔ اس طرح کے اصول محکم ہیں، ان میں مزید کسی نکتہ آفرینی کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت البتہ وہ اصول جو احوال زمانہ اور عامۃ الناس کے عرف و عادت کے پیش نظر فقہاء نے وضع کیے تھے، کوئی وجہ نہیں کہ حالات کے اتنے بدل جانے کے بعد بھی ان پر نظر ثانی کرنا کوئی گناہ ٹھہرے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ زمانہ اول میں شخصی زندگی کی ضرورتیں کم تھیں، اٹھارہ بیس سال کی عمر میں باپ اپنے بچوں کی شادی کر دیتا اور بچے اپنے دم خم پر زندگی کا آغاز کر دیتے، آج کا حال یہ ہے کہ ۲۵/ سے ۳۰، ۳۵/سال تک تعلیم کا مرحلہ ہوتا ہے پھر اس کے بعد کئی سالوں تک ملازمت کے لیے خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں جا کر کوئی اپنے قدم پر کھڑا ہونے کا اہل ہوتا ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ فقہائے سابقین نے ماپ کے اوپر بچے کی کفالت کی جو مدت متعین کی تھی جس پر بہت سے دوسرے مسائل متفرع ہوتے ہیں، اس پر از سر نو غور کیا جائے۔ اسی طرح نماز جمعہ کی صحت کے لیے شرائط، فقہاء نے اپنے دور کے مطابق مقرر کیے تھے اور اپنے اعتبار سے ممالک کی شرعی تقسیم اور گاؤں اور شہر کی تعریف کی تھی، اب ضرورت ہے اس بات کی کہ فقہائے سابقین کی ان تعریفات وتحدیدات پر نظر ثانی کی جائے۔ برصغیر کے سرکردہ علما و فقہا کے حضور ہم مذکورہ مطالبات تسلیم کرنے کی وکالت تو نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان مطالبات سے یکسر چشم پوشی یا اعراض بھی نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی یہ رویہ اس مسئلہ کا مستقل حل ہے۔

اصول فقہ میں اجتہاد کے تعلق سے آج کچھ خام فکر افراد یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا ضرور ہے کہ ائمہ اربعہ نے جو اصول بنا دیے ہم آج بھی انہی کو سینے سے لگائے رکھیں۔ ہمیں خود سے براہ راست کتاب وسنت کی رہنمائی میں اصول وضع کرنے چاہیے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کی باتیں وہ کرتے ہیں جو شریعت کے حروف ابجد سے بھی واقف نہیں، اب انہیں کون بتائے کہ اس طرح کا اجتہاد، اجتہاد مطلق کے باب سے ہے، جو درحقیقت مجتہد مطلق کا عمل ہے، جو کسی کا مقلد نہیں ہوتا، نہ اس کا جسے اجتہاد وتقلید کے معنیٰ تک نہیں معلوم، نہ ہی یہ اس کا عمل ہے جس

نے خیر القرون کے اعلم و وافقہ مجتہدین کی تقلید کی بجائے شاذ ومنفرد رائے رکھنے والے متاخر علما کی غلامی کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔

مقلد یا غیر مقلد ہونے کی بنیاد درحقیقت اصول فقہ میں اجتہاد کرنے یا نہ کرنے پر ہی ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی اور امام احمد رضا بریلوی اور معاصر جبال علم وفن، حنفی علماء وفقہاء اسی معنی میں حنفی ہیں کہ انھوں نے اصول میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کی، یہی وجہ ہے کہ فروعیات میں بہت سے اختلافات اور تفردات کے باوجود یہ تمام حضرات حنفی ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ آسمان شریعت کے ان تمام ماہ ونجوم نے امام ابوحنیفہ کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ ان کے اوپر امام کے اصول کی صداقت روشن ہوئی اور انھوں نے امام ابوحنیفہ کا بابصیرت اتباع کیا۔ موجودہ دور کے تمام علماء ومشائخ بھی کسی نہ کسی امام کے مقلد ہیں، کوئی بھی غیر مقلد نہیں، کیوں کہ غیر مقلد صرف مجتہد مطلق ہوسکتا ہے اور اجتہاد مطلق کا دروازہ باوجود اس کے کہ آج بھی کھلا ہوا ہے مگر کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو اس میں داخل ہونے کی صلاحیت یا کم از کم جرأت ہی رکھتا ہو۔ جرأت کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ آج یہ کہنے والے تو بہت ہیں کہ کیا ضرور ہے کہ ہم آج بھی ائمہ کی تقلید کریں لیکن عملی طور پر کوئی اصول اجتہاد وضع کرے، ایسا ایک شخص بھی نہیں۔ ہاں یہ غلط فہمی ضرور رائج ہوگئی ہے کہ شیخ ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ کی تقلید کو لوگ مخالفتِ تقلید سمجھ بیٹھے ہیں جب کہ یہ تقلید خود اتنی جامد ہے کہ ایسے مقلدین ''مداحق'' شیخ ابن تیمیہ ابن قیم اور البانی کے فرمودات میں منحصر مانتے ہیں اور طرفہ یہ کہ ان کی بات خواہ کتنی ہی قوی دلائل سے رد کر دیجیے وہ اپنے موقف سے اس اعتقاد کے ساتھ چمٹے رہیں گے کہ وہی حق ہے اور ان کے مخالفین ہزار ہزار دلائل رکھنے کے باوجود تقلید جامد کا شکار ہیں۔

عصر حاضر میں اجتہاد کی بات آ ہی گئی ہے تو عالم عرب کے ان جدید مجتہدین کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اجتہاد کیا کر رہے ہیں، شریعت کے شیش محل میں بیٹھے مجتہدین سابقین پر سنگ باری فرما رہے ہیں، اپنی ژرف نگاہی اور گہرے تفقہ سے ایسے ایسے لطیف نکات اور اجتہادات علمیہ پیش فرما رہے ہیں کہ اگر انھیں ابن الجوزی کی ''کتاب الحمقاء والمغفلین'' میں شامل کر دیا جائے تو کتاب اور وقیع ہو جائے اور عصر حاضر کے معیار اسلوب پر بھی پورا اترے،

اس کی مثال شیخ مراغی سابق شیخ ازھر کا یہ اجتہاد ہے کہ مجتہد کے لیے زبان عربی سے آشنا ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح بعض دوسرے مجتہدین کا ٹیلی ویژن پر جواز اقتدار کا فتویٰ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

اسی نوعیت کا وہ اجتہاد بھی ہے جو ہندوستان میں جاوید اختر، شبانہ اعظمی، پروفیسر طاہر محمود اور کبھی کبھی صحافت مآب جناب عزیز برنی فرماتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ بڑے ہی شدومد کے ساتھ اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہندومت میں پنڈتوں اور یہودیت و عیسائیت میں ربیوں اور راہبوں کا شریعت پر تسلط ہے، مگر اسلامی شریعت پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں۔ اب اس جہالت پر کب تک ماتم کیا جائے کہ شریعت اسلامیہ پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہ ہونے کا صرف یہ معنی ہے کہ اس پر کسی خاندانی طبقہ کا تسلط نہیں، اس میں جس طرح کسی سیّدزادے عالم کو اپنی بات کہنے کا حق ہے ایک معمولی خاندان کے فرزند کو بھی ہے جس نے علوم شریعت حاصل کیے ہوں۔ یہ معنی نہیں کہ شریعت میں عالم و جاہل یکساں طور پر نکات آفرینی کے مجاز ہیں۔ قرآن کا واضح حکم ہے، **ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لایعلمون** جاہل و عالم برابر نہیں ہوسکتے۔ مزید یہ کہ شریعت اسلامیہ میں گفتگو فقہ و قانون کی گفتگو ہے اور یہ گفتگو وہی کرسکتا ہے جس نے قوانین اسلامیہ کا گہرا مطالعہ کیا ہو صرف اسلام کی تاریخ، تفسیر کا مطالعہ اور بخاری و مسلم کے اردو یا انگریزی ترجمے پڑھ لینے سے بھی کسی کو شرعی قوانین میں لب کشائی کا حق نہیں دیا جاسکتا، یہ تو اختصاص (Specialization) کی بات ہے جسے شاید موجودہ دور میں بہت زیادہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔

خلاصہ یہ کہ نہ تو اجتہاد کرنا جرم ہے اور نہ تقلید کرنا حرام، جو اجتہاد کے اہل ہوں ان کے لیے تقلید ناجائز ہے اور جو تقلید کے اہل ہیں ان کے لیے اجتہاد ناجائز۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے جسے ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ لیکن بایں ہمہ ہر آدمی کو طلب مزید کی کوشش جاری رکھنی چاہیے، ذہن وفکر کو مقفل کر دینا انسانی ترقی کے آگے بند باندھ دینے کے مرادف ہے۔ ہر شخص کو بارگاہِ خدا میں **رب زدنی علما** کی دعا کرنی چاہیے اور اپنے اپنے طور پر اس کی بھرپور کوشش بھی۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اکتسابہ وارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابہ۔